ہزار امکاں

ڈاکٹر فرید پربتی

امیکس بکس سرینگر

ہزار امکاں

ڈاکٹر فرید پربتی

امیکس بکس سرینگر

نام کتاب	:	ہزار امکاں
مصنف	:	ڈاکٹر فرید پربتیؔ
کمپوزنگ	:	Continental Computers Soura: 9419705664
اشاعت	:	۲۰۰۷ء
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۲۵۰/روپے

ناشر

امیکس بکس این۔آئی۔ٹی روڑ حضرت بل سرینگر (کشمیر)

Published by: Mir A. Rashid

شاعر کوئی بھی ہو۔ اس کے شناختی انفراد و امتیاز کا تعین ایک دُشوار گذار عمل ہے۔ لیکن معاملہ یہ ہے کہ اس پلِ صراطِ معنی سے گذرے بغیر یہ اندازہ لگایا بھی نہیں جاسکتا کہ کس دور میں کن شاعروں نے عصری ثقافتی تقاضوں کے مطابق، فنی و جمالیاتی، لسانی و معنیاتی اعتبار سے اردو شاعری کی شعری جمالیات کی تشکیل وتوسیع جدید میں کون سا کردار ادا کیا ہے۔ ہاں مگر شرط یہ ہے کہ شاعر کی شاعری میں کوئی ایسی شان، حکمت یا جادو ضرور ہو جو صاحبانِ نظر کو شعر کی گہرائیوں میں اُترنے پر مجبور کردے۔

اس اعتبار سے اگر دیکھا جائے تو فرید پربتی کی شاعری اپنے مطالعہ و محاسبہ کا جواز بہر حال رکھتی ہے۔ نئی نسل میں شعر کہنے والے تو بہت ہیں۔ لیکن ایسے جو واقعی عمدہ اور امکانات سے پر شاعری کر رہے ہیں ان میں فرید پربتی اپنی ایک الگ پہچان رکھتے ہیں۔ اس منفرد شناخت کے کئی اسباب ہیں اول یہ کہ فرید پربتی شعر کے منصب سے واقف ہیں۔ مختلف و متضاد روایات و تجربات اور تحریکات ورجحانات کو برتتے ہوئے اردو شاعری آج جس مقام تک پہنچی ہے

فرید پربتی اس مقام اور اس کے تمام جہات و امتیازات کا گہرا شعور رکھتے ہیں اس لیے فرید پربتی کی شاعری میں لسانی و شعری تہہ داری اور فکری و جمالیاتی پہلوداری کے ایسے اور کتنے نمونے ملتے ہیں جو ان کے کم ہی ہم عصروں کے یہاں نظر آتے ہیں۔

فرید پربتی کم و بیش بیس برسوں سے مشق سخن کر رہے ہیں۔ اس عرصہ میں انھوں نے اپنی شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار اردو شاعری کی تقریباً تمام اصناف اور ہیئتوں میں کیا ہے۔ لیکن بغور دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بنیادی طور پر اُن کے شاعرانہ جوہران کی غزلوں اور رباعیوں میں کھلتے نظر آتے ہیں۔

ابرِ تر (۱۹۸۷ء) آب نیساں (۱۹۹۲ء) اثبات (۱۹۹۵ء) فرید نامہ (۲۰۰۳ء) اور گفتگو چاند سے (۲۰۰۵ء) کے بعد ''ہزار امکاں'' فرید پربتی کے آسمان شعر کا ''چھٹا در'' ہے جہاں فرید پربتی کی تازہ ترین غزلوں، نظموں اور متفرق اشعار کا وافر ذخیرہ نظر آتا ہے اس چھٹے در کے اندر داخل ہو کر اگر موضوعاتی، ہیئتی، لسانی اور جمالیاتی محاسن کے حوالے سے فرید پربتی کے شاعرانہ انفراد و امتیاز کا تجزیہ کریں تو صاف معلوم ہوگا کہ فرید پربتی اپنی شاعری کے اس مقام پر کھڑے ہو کر واقعتاً اردو شاعری کا ساتواں در کھول رہے ہیں۔

فرید پربتی نے اپنے اس تازہ ترین شعری مجموعہ کا آغاز حمدیہ اور نعتیہ اشعار سے کیا ہے۔ یوں حمد و نعت روایتی اصناف ہیں پھر بھی چونکہ خدا اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم، ہر مقام، معاشرہ، عصر اور ثقافت کے لیے ابدی اور اصلی حقیقتیں ہیں اس لیے ہر زبان، زمانہ اور تہذیب کے اندر فطری تغیرات کے

باوجود حمدیہ اور نعتیہ اشعار کا ظہور ہوتا ہی رہا ہے۔ خصوصاً مشرق کی اسلامی ثقافت سے رشتہ رکھنے والی زبانوں کے حوالے سے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے۔ فرید پربتی نے اپنے سبھی شعری مجموعوں میں حمدیہ اور نعتیہ اشعار اہتمام کے ساتھ شامل کئے ہیں اور اس سے فرید پربتی کی ثقافتی بنیادوں کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ فرید پربتی نے حمدیہ اور نعتیہ افکار و خیالات کا اظہار دل کی گہرائی سے جدید ترین لسانی و تخلیقی شعور کے ساتھ کیا ہے۔ اس کا اندازہ درج ذیل اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

حمدیہ اشعار

سمیع کہنا، بصیر کہنا، علیم کہنا، حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا
نوازشیں کیا، عنایتیں کیا، ہے باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہتِ کلی کو رنگت، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

نعتیہ اشعار

جب سخن آپ ﷺ بہ شیریں رطبی کرتے تھے
خوش نوایانِ چمن اپنی نفی کرتے تھے
کوئی پتھر بھی اگر مارے دعا دیتے ہیں
یہ وہی کام ہے جو پیارے نبی کرتے تھے

میں نے فرید کے بارے میں پہلے بھی لکھا ہے کہ فرید پربتی بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور غزل وہ صنف سخن ہے جس میں عصری تہذیبی اور معاشرتی

روایات اور تقاضوں کا اظہار جمالیاتی زبان میں ہوتا ہے۔ لہٰذا روایات اور اجتہادات کے مختلف و متضاد مرحلوں سے گذر کر آج کی غزل بھی معاشرتی اور ثقافتی مد و جزر کی مختلف االنوع لہروں اور دائروں کو اپنے اندر سمیٹتی ہوئی اردو شاعری کے لسانی، معنیاتی اور جمالیاتی امکانات کو زیادہ سے زیادہ روشن اور وسیع کر رہی ہے۔ چنانچہ فرید پربتی کے اس مجموعے "ہزار امکاں" کا مطالعہ کرتے ہوئے بھی یہ بات شدت سے محسوس ہوتی ہے کہ فرید پربتی کی غزلیہ شاعری (بلکہ نظمیہ شاعری بھی) اردو غزل (شاعری) کی مضبوط و مستحکم روایت پر اپنی اساس رکھتی ہے۔ لیکن اپنے اندر میں اپنی تخلیقی شرطوں کے ساتھ۔ ورنہ فرید پربتی کے اکثر و بیشتر ہم عصر شاعروں کے یہاں روایت کا احترام تو ملتا ہے لیکن عام طور پر سینئر شعراء کے مضامین اور طرز بیان کی نقل و تکرار کی صورت میں۔ یہی خاص بات فرید پربتی کی قوت اور ان کے ہم عصر شاعروں کی کمزوری ہے۔ دراصل فرید پربتی کی شاعری میں یہ امتیاز، اساتذہ کے غیر معمولی لسانی شعور اور اظہار و بیان کے مثالی نمونوں (Patterns) کی گہرای واقفیت کا نتیجہ تو ہے لیکن اس ضمن میں فرید پربتی کے یہاں عام طور پر Conventional اور Referential معانی سے الگ الفاظ کا جو تازہ کار اور تہہ دار لسانی برتاؤ ملتا ہے اس کی وجہ سے فرید پربتی کی غزل کلاسیکی غزل کے لسانی اور اظہاری رویوں سے رشتہ قائم رکھتی ہے لیکن دوسری جانب عصری زندگی اور ثقافت کے حوالے سے سوچ اور فکر کو تخلیقی تجربہ کے بطور شعر میں پیش کرنے کی ہنر مندی کے سبب جدید ترین لسانی، فنی اور جمالیاتی شعور کا جواز بھی پیش کرتی ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی نے کہا ہے "یہ بالکل ممکن ہے

کہ غزل جدید بھی ہو اور کلاسیکی اصولوں کی پابندی بھی کرے'' فرید پربتی کی غزل اس کی عمدہ مثال ہے۔ اس کا اندازہ ''ہزار امکاں'' میں شامل اس طرح کے اشعار سے لگایا جاسکتا ہے۔

جب حدِ ادراک پھاندوں بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشۂ سود و زیاں کہنا مجھے

شکستہ پیکروں میں رنگ بھرنا آ گیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آ گیا ہوگا

خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اِک دُکان پر

فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سائے سے نئی بات بھی ہوگی

دوران گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

نیندوں کا قحط خوابوں کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گے آنکھیں خواب سے ڈر

غزل میں نادر ونایاب مشکل اور غیر روایتی ردیف وقوافی کا استعمال اب عام سے بات ہوگئی ہے لیکن نئے معتبر شاعروں میں عرفان صدیقیؔ، اسعد بدایونی عبدالاحد ساز اور عالم خورشید کے ساتھ ساتھ فرید پربتیؔ بھی ایسے شاعری ہیں جس نے اس بات میں محض جدت پسندی کا مظاہرہ نہیں کیا ہے بلکہ تازہ مضامین اس طرح باندھے ہیں کہ شعر میں معنوی پہلوداری بھی پیدا ہوگئی ہے اور غزل کی شان میں بھی اضافہ ہوا ہے۔

بیتاب، بے قرار، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی ایک تیرہ بخت تھا

کئی دِنوں سے محبتوں کی فضا ہے ناخوشگوار جاناں
نظر نظر میں ہوس ہے قائم نہ دل کا نکلا غبار جاناں

قلب ونظر کا مسئلہ یوں حل بھی ہے
اے دِل تری تباہی، کچھ اپنا سبب بھی ہے

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دِیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

اردو غزل میں عاشق اور معشوق، زاہد اور شیخ، ناصح اور رقیب زندگی اور زمانہ کے حوالے سے راست اور واضح کردار سازی کی روایت رہی ہے۔ یہ کردار عام طور پر شاعر کے تخیل وتصور کی پیداوار ہوتے ہیں۔ ترقی پسند غزل سے قطع نظر کلاسیکی غزل سے لے کر جدید غزل تک ایسے اشعار کثرت سے ملتے ہیں جن میں ان

کرداروں کو اس طرح پیش کیا گیا ہے کہ غزل میں انسان اور انسانیت مخالف فضا پیدا ہوئی اور یہ کردار قاری کے اندر یاسیت، بے یقینی حتیٰ کہ خودکشی تک کے رجحانات پیدا کرنے کا سبب بنتے رہے ہیں۔

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

دردؔ

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

ذوقؔ

نہ پوچھ حال مرا چوب خشک صحرا ہوں
لگا کے آگ مجھے کارواں روانہ ہوا

آتشؔ

آ کے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اُس پیڑ کے پھل تھے پس دیوار گرے

شکیب جلالی

لیکن آج عبدالاحد ساز، عالم خورشید، راشد انور راشد وغیرہ کے ساتھ ساتھ فرید پربتیؔ کے یہاں جو کردار سامنے آ رہے ہیں وہ محض تخیل و تصور کی پیداوار نہیں بلکہ نئے معاشرہ کے مختلف و متضاد حالات و حقائق، سوچ و فکر اور اعمال اور رویوں کے زائیدہ حقیقی کردار ہیں جو قاری کے اندر عصری زندگی اور زمانہ کے حوالے سے

جینے کا نیا حوصلہ پیدا کرتے ہیں ۔

تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کو دیا بن کے میں چلتا ہوں اکیلا
مانا کہ مرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

اس طرح موجودہ منظرنامے پر اردو شاعری کے معیار کا مستحکم جواز پیش کرنے والے شعراء میں فریدؔ پربتی ایک اہم نام ہے اور ہزار امکاں اُن کی شاعرانہ ہنرمندی کا ثبوت فراہم کرنے کے لیے کافی ہے۔

سرینگر پروفیسر قدوس جاوید



سمیع کہنا، بصیر کہنا، علیم کہنا، حکیم کہنا
وہ اپنی عظمت سے خود ہے واقف اُسے تو ربِ عظیم کہنا

نوازشیں کیا، عنایتیں کیا، ہیں باغ و بن کی روش روش پر
گلوں کو نکہتِ کلی کو رنگت، عطا ہے کس کی نسیم کہنا

دلوں کے سب بھید جانتا ہے صدا صدا ہے اُسی پہ روشن
رحیم و رحمٰن صفت ہے اُس کی اُسے تو رب کریم کہنا





جب سخن آپ ﷺ بہ شریں رطبی کرتے تھے
خوش نوایانِ چمن اپنی نفی کرتے تھے

کوئی پتھر بھی اگر مارے دعا دیتے ہیں
یہ وہی کام ہے جو پیارے نبی ﷺ کرتے تھے

روبرو اُن کے نہ تھی نام و نسب کی قیمت
آپ ﷺ سکھلا کے عمل سب کو دھنی کرتے تھے

پھینک دی ریت تو دھنسنے لگے اُس میں کفار
دستِ اللہ سے وہ جیسے رمی کرتے تھے

جنگ ہو صلح ہو رہتے تھے حدوں میں ہر وقت
تھا جو فرمانِ خدا آپ ﷺ وہی کرتے تھے

واقعہ یاد دلاتا ہوں سراقہؓ کا تمھیں
دیکھو محبوبِ ﷺ خدا کیسے دھنی کرتے تھے

چلتے پھرتے تھے حقیقت میں وہ قرآن فریدؔ
اس لیے خُلق کی چھاؤں کو گھنی کرتے تھے





ہوتی ہے جب فضا کبھی مسموم بے طرح
کٹتا ہے پھر حسینؑ کا حلقوم بے طرح

جب دیکھتا ہوں پھول سے بچے کو گود میں
آتا ہے یاد اصغرِؑ معصوم بے طرح

کٹنا تھا کیوں پسند نہ جھکنا تھا کیوں پسند
کھلتا ہے ہر جری پہ یہ مفہوم بے طرح

دنیا ہے وہ فرات جہاں کل حسینؑ کو
رکھا گیا تھا پانی سے محروم بے طرح

یہ شہر کربلا سے نہیں کم کس طرح
ہر حق پرست ہے یہاں مظلوم بے طرح

اپنی شکست ہی کو سمجھتے ہیں فتح لوگ
کس بات پہ مچاتے ہیں یہ دھوم بے طرح

دل میں بسا ہے عشقِ حسینؑ و حسنؑ فریدؔ
اس وجہ سے چمکتا ہے مقسوم کی بے طرح





ہوا مزاج ہے اور عاجلانہ رہتا ہے
مجھے تو اُنس اُسے والہانہ رہتا ہے

بنایا اُس نے جہاں کو بہت ہی عجلت میں
توازن اِس لیے یاں جابہ جانہ رہتا ہے

یہاں پہ خوف زدہ جس ہوا سے ہے اک ایک
اُسی کی زد پہ میرا آشیانہ رہتا ہے

زمین کے رنگ کا اُس نے بچھا دیا ہے دام
اُسی کے نیچے مرا آب و دانہ رہتا ہے

بچا کے رکھ لیے جو خواب اپنی خاطر تھے
اُنہی کی تاک میں سارا زمانہ رہتا ہے

مجھے گرانہ کی دھن اُس پہ ہے سوار بہت
مرا سلوک اُسے دوستانہ رہتا ہے

ملن ہی جس کا ہے مضموں نہ دردِ فرقت کا
مری زباں پہ اک ایسا فسانہ رہتا ہے

کبھی میں رہتا نہیں دشمنوں سے ہوں خائف
اِنہیں سے زیست کا مجھ کو بہانہ رہتا ہے

برستا ہے تو برستا ہے بانجھ دھرتی پر
یہ ابر میری طرح بے ٹھکانہ رہتا ہے

فریدؔ لگتا نہ شاعر ہے اپنے نکھ سکھ سے
مزاج اس کا فقط شاعرانہ رہتا ہے





کوئی طلب نہ کوئی آرزو ہے میرے پاس
گذشتہ عیش کی اک گفتگو ہے میرے پاس

غنی کرے گا مجھے تیرا بس مرا ہونا
نہیں ہے کچھ بھی ضرورت جو تُو ہے میرے پاس

چلا رہا ہے ہَوا میں ہی تیر جو اکثر
عجیب طور کا وہ جنگجو ہے میرے پاس

یہ جانتے ہوئے شورہ زمیں کا مالک ہوں
اُسے یقین ہے طرزِ نمو ہے میرے پاس

ہدف بنانے لگا میری کج کلاہی کو
وہی جسے ہے پتہ آبرو ہے میرے پاس

تصنّعات کا قائل نہیں ذرا بھی میں
اگر چہ کثرتِ ہر رنگ و بو ہے میرے پاس

تلاش فوج جسے خندقوں میں کرتی ہے
چھپا ہوا وہی میرا عدو ہے میرے پاس

میں آزمانے لگا ہوں خموشیاں اپنی
اگر چہ مملکتِ ہاو ہو ہے میرے پاس

تمام جسم کو ڈسوا رہا تھا سانپوں سے
عجیب شخص وہی جس کی خو ہے میرے پاس

کبھی کروں گا فریدؔ اس زمین کو سیراب
رگوں میں دوڑتا تازہ لہو ہے میرے پاس





گماں کی سرحدوں سے پار نکلا
ہَوا رفتار میرا یار نکلا

جسے پُر پیچ سمجھا تھا میں اب تک
وہ رستہ آخرش ہموار نکلا

وہ برفیلی فضا میں پلنے والا
مرے جیسا ہی آتش خوار نکلا

تجھی سے تجھ کو دیکھو مانگتا ہے
ترا طالب بھی دنیا دار نکلا

میں خواہاں خود سے ملنے کا بہت ہوں
مگر یہ مرحلہ دشوار نکلا

تمنا، خواب، یادیں، کچھ نہ چھوڑا
وہ سُونا کر کے سب بازار نکلا

نگل ڈالے ہیں تارے ظلمتوں نے
تجسس میرا شب بیکار نکلا

بھلکڑ ہم فریدؔ اس کو تھے سمجھے!
وہ یادوں کا امانتدار نکلا



سخن گواہ ہے جو میری نیک نامی پر
نثار کرتا ہوں وہ تیری خوش کلامی پر

سفید فاموں نے دنیا میں وہ ستم ڈھائے
کہ شرم آتی ہے اپنی سفید نامی پر

سگِ زمانہ بھی جس کو سمجھ رہا ہے عار
کیا ہے وقف میں نے خود کو اُس غلامی پر

جو دائروں میں ہمیشہ ہی چلتے رہتے ہیں
وہ حرف رکھتے ہیں تیری صبا خرامی پر

وہ دوسرے کے کبھی عیب گن نہیں سکتا
نگاہ جس کو ہمیشہ ہو اپنی خامی پر

جو معترف ہے نہیں اُس پہ لطف ہے اُن کا
عتاب کرتے ہیں وہ اپنے ہر سلامی پر

جو مارنا تھا مخالف پہ اب کے مجھ کو فریدؔ
وہ تیر میں نے چلایا ہے اپنے حامی پر



وقت بے وقت یونہی کرتا ہے ناشاد مجھے
عیش کے دن وہ دلاتا ہے بہت یاد مجھے

ہے مرا پختہ یقین سنگ میں ڈھلنے سے قبل
اس طلسمات سے کردے گا وہ آزاد مجھے

چیختا ہوں تو بہت اس کو مزا آتا ہے
اس لیے کرتا ہے وہ مائلِ فریاد مجھے

غیر نے جس کو اُٹھایا ہے بڑے ضبط کے ساتھ
وہ سمجھنے لگا اُس فتنے کی بنیاد مجھے

بے طرح کھلنے لگی سب کو مری بے سمتی
کس جگہ لے کے چلا ہے مرا ہمزاد مجھے

جامہ زیبی سے تری مجھ کو نہیں کچھ اِنکار
پر لُبھاتا ہے بہت حسنِ خدا داد مجھے

جانتا ہوں کہ مقابل میرا روئیں تن ہے
اس لیے کرنا پڑا خود بھی فولاد مجھے

میرا ہر دکھ وہ سمجھتا ہے فریدؔ اپنا دُکھ
یہی اک زعم نہ کردے کہیں برباد مجھے



مدت سے مجھے اُن کے خیالاں نہیں آتے
بھولوں میں اُنہیں ایسے کمالاں نہیں آتے

تیار ہے دینے کو جواب اُن کا زمانہ
کیوں یاد مجھے اپنے سوالاں نہیں آتے

نافہ بھی میسّر نہیں یادوں کا ہے دل کو
اب دشت میں رم خوردہ غزالاں نہیں آتے

پھیکا ہوا ہے تب سے ہر انداز سخن کا
جب سے یہاں شیرین مقالاں نہیں آتے

سورج ہے کہ ٹوٹا ہوا بچے کا کھلونا
یکمشت کئی دن سے اُجالاں نہیں آتے

بے جڑ کے درختوں پر ثمر لگتے نہ دیکھا
دیکھو ہمیں بھی ایسے کمالاں نہیں آتے

ٹھنڈا پڑا ہر جذبہ مرا جن سے بچھڑ کر
اِس سمت وہ آسودہ جمالاں نہیں آتے





اک معمے کی ہوئی نشو و نما پانی پر
کر گیا ہوں میں رقم حرفِ وفا پانی پر

میری تو پیاس بجھے گی تیرا کیا جائے گا
والیٔ آب نہ یوں دل کو دکھا پانی پر

بارہا آگ پلائی گئی پھولوں کو یہاں
بارہا کاٹے گئے دستِ صبا پانی پر

یاد کے گہرے سمندر میں نہ ڈالو پتّھر
دائرے کھینچتی ہے موجِ ہوا پانی پر

تیرنے والے کہاں دیکھتے ہیں موجوں کو
فیصلہ چھوڑتے ہیں اچھا برا پانی پر

کاغذی ناؤ یہ کیا پار اُتارے گی فریدؔ
خود کو نادان تماشا نہ بنا پانی پر





ایک احساسِ ضرر مجھ کو دیا
خود سے لڑنے کا ہنر مجھ کو دیا

پھول، سبزہ، شاخ سب اُس نے لیے
اک نہالِ بے ثمر مجھ کو دیا

باغ کی رونق ہوئی جس سے ہَوا
وہ فسادِ خشک و تر مجھ کو دیا

پست ہمت، بے بصر اور ست گام
دیکھ کیسا راہبر مجھ کو دیا

ماحصل سے بے یقیں کر کے فریدؔ
مرحلوں کا دردِ سر مجھ کو دیا





ہم فکر دل و جاں میں فغاں کر نہیں پاتے
وہ اب کے گزرتی ہے بیاں کر نہیں پاتے

اس درجہ بڑھے نقل مکانی کے یہاں شغل
تعمیر کہیں پر بھی مکاں کر نہیں پاتے

اک موسمِ سفاک کی زد پر ہیں ہمیں کیوں؟
کیا اس لیے کہ مشقِ سناں کر نہیں پاتے

یہ کیا کہ شب و روز فقط اُن کی تمنّا
یہ کیا کہ محبت کو عیاں کر نہیں پاتے

شاخوں سے لپٹتی ہے ابھی صرصرِ موہوم
بے برگ و نوا عزمِ جواں کر نہیں پاتے

اے خواہشِ دل نقش نہ کر آبِ رواں پر
نظّارہ اندوہ نشاں کر نہیں پاتے

☆☆☆



کارِ دنیا میں نہ کھو جائیں یہ سب ڈر نکلے
ہم تری یاد کو سینے سے لگا کر نکلے

اب اُسی شہر میں میں کرتا ہوں طلب جائے اماں
لوگ جس شہر سے جان اپنی بچا کر نکلے

میرے ہر خواب کی تعبیر سے گھبراتے ہیں
ہاں مرے بھائی بھی یوسفؑ کے برادر نکلے

کل تلک تول رہے تھے یہی پھولوں میں مجھے
آج کیا بات ہے آمادۂ خنجر نکلے

وقت کے ایسے تصوّر سے لرز اُٹھتا ہوں
جب ہوا کاٹ کے ہر شاخِ ثمر در نکلے

ماں کے قدموں میں ہے جنت کہیں محروم نہ ہوں
یہ سبب ہے نہ کبھی چھوڑ کے ہم گھر نکلے

شوخ جھونکا تھا صبا کا کہ تھی چلتی مقراض
جتنے طائر تھے چمن میں سبھی بے پر نکلے

حال میں آپ تھے اپنے ہی گرفتار فریدؔ
پھر بھی آشوب زمانہ میں منوّر نکلے





رہ شکستہ، فاصلے، دشت و سراب
سلسلے ہیں، زیست کے، دشت و سراب

کچھ نہیں میرے لیے جز تشنگی!
میری قسمت میں لکھے، دشت و سراب

اُس جگہ مجھ کو اُڑا لائی ہَوا!
ہیں جہاں کے آسرے دشت و سراب

کیوں نہ قیمت خود شناسی کی بڑھے
آئینے بننے لگے دشت و سراب

جانے کس کے گھر مجھے لے جائیں اب
بے نوائی، رت جگے دشت و سراب





عہدِ وفا، قول و قسم، اللہ بس، باقی ہوس
تیرے ستم، تیرے کرم، اللہ بس باقی ہوس

بادِ صبا، تتلی کلی، غنچہ سمن، رنگِ چمن
ایک ایک کر جائیں گے رم، اللہ بس باقی ہوس

تاروں کے جھرمٹ میں لگی لو چاندنی پھر جھومنے
سونا بکھرتی دم بدم، اللہ بس، باقی ہوس

پیاسی زمیں، پیاسے مکیں، ترسیں گے کب تک بے یقیں
چھم چھم برس ابرِ کرم، اللہ بس، باقی ہوس

سب منزلیں، سب کارواں، اوّل فنا آخر فنا
گردِ سفر، نقشِ قدم، اللہ بس باقی ہوس

کوفہ ورَے یہ جم وقے، من جملہ حاصل بس یہ ہے
جمشید ہو یا جامِ جم، اللہ بس، باقی ہوس

کرتے ہیں بس اہلِ ہوس دین ودھرم کی بات یہاں
یہ فتنۂ دیر و حرم، اللہ بس باق ہوس

تو نے فریدؔ اب کے کہی کیسی یہ مستانی غزل
جذبات کا یہ زیر وبم، اللہ بس باقی ہوس



ہوا مزاج ہے ہم لوگ جانتے ہی نہیں
کہاں قیام ہے کرنا کہاں ٹھہر جانا





رگ و پے میں سرایت کر گیا وہ
مجھی کو مجھ سے رخصت کر گیا وہ

نہ ٹھہرا کوئی موسم وصلِ جاں کا
متعین راہ فرقت کر گیا وہ

من و تو کی گری دیوار سر پر
بیاں کیسی حقیقت کر گیا وہ

درونِ خانہ سے غافل ہے لیکن
برونِ خانہ زینت کر گیا وہ

سرِ شب ہی میں اکثر جل بُجھا ہوں
ہر اک خواہش کو لت پت کر گیا وہ

حوادث کا وہ تندو شوخ جھونکا
ثمر دل کے اکارت کر گیا وہ

متاعِ غم چھپا کر کیوں نہ رکھوں
حوالے یہ امانت کر گیا وہ

تمھیں بھی بھولنے کوششیں کی
کہ خود پر بھی قیامت کر گیا وہ

سکوں آمیز لمحوں میں فریدؔ اب
فروغِ رنج و محنت کر گیا وہ





خلوص و مہر کی طرزِ ادا نہ راس آئی
تمہارے شہر کی آب و ہوا نہ راس آئی

میں جانتا ہوں کہ ماتم کا ماحصل کیا ہے
اِسی لیے مجھے آہ و بُکا نہ راس آئی

بجی کُجھی ہوئی سانسوں کا دے رہا ہوں حساب
سلگتی ریت کو رم جھم ذرا نہ راس آئی

دیا جو تو نے وہ لوٹا دیا سبھی میں نے
مجھے یہ دوستی گندم نما نہ راس آئی

بُجھا ہے دل کو کنول عرصۂ بہار میں ہی
شگفتہ پھول کو بادِ صبا نہ راس آئی

اُداس شام کے سائے یہ پوچھتے ہیں فریدؔ
محبتوں کی تجھے کیوں ضیا نہ راس آئی



بھول جائے گا بھلا کیسے یہ منظر کوئی
پھنکتا آس کے شیشے پہ ہے پتھر کوئی

ڈال دے خاک نہ اب اُس کی طلب پر کوئی
پھر سے نکلا ہے تجھے ڈھونڈنے گھر گھر کوئی

وہ سمجھ بیٹھے تھے اُس کو بھی شناور کوئی
لے کے ڈوبا ہے اُسے تیز سمندر کوئی

اب غمِ زیست نے ہر سمت سے آ گھیر لیا
مجھ کو کر دیتا غمِ عشق میسر کوئی

بھول بیٹھا ہوں یہ کوتاہ قدوں میں یارو
آ ہی جائے گا مرے قد کے برابر کوئی

پا بہ جولاں کہیں کر دے نہ مجھے روک یہ ٹوک
رستہ روک رہا ہے مرا اکثر کوئی

میری ہر جیت نے رُخ بدلا اِسی منطق پر
کہ حمایت کے لیے آئے گا لشکر کوئی

دل تو بھولا تھا اُسے وقت کے دھارے مگر
یاد آتا ہے مجھے پہلے سے بڑھ کر کوئی

میں اُنھیں بھولا ہوں اس میں ہے صداقت اتنی
بھیج دیتا ہے یہ اکثر انھیں لکھ کر کوئی

کیا زوالِ من و تو قرب میں پرکھو کے فریدؔ
فاصلہ اور بڑھا دیتا ہے مل کر کوئی





امیّدوں کا سجا ہوا محمل ہے زیرِ آب
مدّت کی دوڑ دھوپ کا حاصل ہے زیرِ آب

اے چشمِ گریہ ناک یہ منظر بھی دیکھتا
کشتی ہے سطحِ آب پہ ساحل ہے زیرِ آب

پانی تمہاری یاد کا سر سے گزر گیا
اب تم کو بھی پکارنا مشکل ہے زیرِ آب

مچلی ہے موجِ تمنّا جو دید کی
شاید اِسی سبب سے مرا دل ہے زیرِ آب

ٹھہروں اگر تو وسوسہ طغیانیوں کا ہے
اور لوٹنا بھی چاہوں تو منزل ہے زیرِ آب





قربت کے سنہرے باب سے ڈر
جل جائیں گی آنکھیں خواب سے ڈر

یہ وصل کی فصل بھی بیتے گی
فرقت کے روزِ حساب سے ڈر

دلگیر کرے گا وہ چہرہ
رنگوں کی ایسی کتاب سے ڈر

جل تھل ہے غموں کی ہر کھیتی
ہر جائی بادو سحاب سے ڈر

خوشبو کے تعاقب میں چل کر
صد برگ اور گلاب سے ڈر

اظہار کی سولی پر چڑھ کر
انکار کے آب و تاب سے ڈر

سبزے کی طرح راوندے گا تجھے
اخلاص کے پائے رکاب سے ڈر

کوشش نہ بھلانے کی اُسے کر
یادوں کے سخت عذاب سے ڈر

بے ڈھب ہیں تیرے جذبات فریدؔ
مضراب سے ڈر نہ رباب سے ڈر





رہِ تمنّا قدم قدم رہ گزارِ بے سنگ میل نکلا
قلیل سمجھا میں جس سفر کو وہی بالآخر طویل نکلا

غبار وحشت اُسی ڈگر پر جنوں کو بے دست و پا نہ کردے
غمِ جہاں سے غمِ وفا تک جہاں پہ ہر پل عجیل نکلا

وہ اک سخن اعتبارِ صبر و شکیب جس کو کہا گیا تھا
وہ اک سخن ہی دُکھا کے دل کو فروغِ متنِ دلیل نکلا

عتابِ نمرود بے ثمر ہے یہ معجزہ کم نہیں ہے یارو
میں عصرِ حاضر کے سنگ و آہن سے بچ کے مثلِ خلیلؑ نکلا

حصولِ مرہم میں حد سے گزرا مآل دیکھا یہ عجلتوں کا
نمک سے بھرنے تمام زخموں کو پھر سے دستِ جمیل نکلا

وہ ایک لمحہ جو اہلِ دل کو سکھا گیا بے کرانیاں ہے
وہ ایک لمحہ ہی شہرِ جاناں سے کر کے آخر ذلیل نکلا

مآلِ وحشت اگر یہی ہے تو پھر یہ کیا ہے فریدؔ صاحب
ہر ایک رشتہ رہِ تمنا میں خونِ دل کا کفیل نکلا





کتابِ صبر میں لکھا ہوا حرفِ اعادہ ہوں
جہاں پر تم نے چھوڑا تھا وہیں پر ایستادہ ہوں





سر پہ رنج و تعب نہیں آتے
سوچتا ہوں میں کب نہیں آتے

مدتوں جی لیے مگر اب تک
زندہ رہنے کے ڈھب نہیں آتے

ٹھن گئی جنگ کے حریفوں میں
امن کے روز و شب نہیں آتے

جن کو کہنا تھا روبرو اُن کے
وہ سخن تا بہ لب نہیں آتے

توڑنے دامنِ تہی کا بھرم
تیری محفل میں سب نہیں آتے

بات کوئی ضرور ہوگی فریدؔ
یاد وہ بے سبب نہیں آتے





چور ساغر عیش کا ساغر شکن نے کردیا
کام اچھا یہ نہیں اُس پر فتن نے کردیا

مر گئے بے تیشہ اکثر چاہنے والے یہاں
کیا کوئی کارِ نمایاں کوہکن نے کردیا

ہر خس و خاشاک کی محضر پہ مہریں لگ گئیں
مجھ کو رخصت اس طرح اہلِ چمن نے کردیا

اک ذرا بھاتا نہیں ہنگامۂ عیش و نشاط
دل بہت بیزار کیفِ انجمن نے کردیا

اب میں اپنے آپ سے لڑتا ہوں اکثر بے سبب
کس قدر خود سر مجھے شوریدہ پن نے کردیا

اب صبا کی آمد و شد لطف کا مظہر نہیں
معترف صرصر کا اُس کے بانکپن نے کر دیا

کر رہا ہوں اب حذر پُر پیچ رستوں سے فریدؔ
مجھ کو آسودہ خیالِ راہ زن نے کر دیا





ابتری پھیل گئی بزم جہاں میں اتنی
کہ کھلا رکھ کے درِ خواب کو سونا مشکل





ہوگئی ہے زندگی بے رنگ و آب
آخرش اُس نے دیا سیدھا جواب

راستوں کے پیچ و خم بتلا گئے
ایک دن ہونا ہے مجھ کو کامیاب

خواب کی کھڑکی کھلا رکھ کر نہ سو
آگیا ہے شہر میں پھر انقلاب

میں اُسے اس سے لگا ہوں مانگنے
دیکھ نادانی مری! میرے جناب

میرے آنگن کو ضرورت ہے بہت
بھیج دے اس میں کوئی تازہ گلاب

میں نہیں بادِ صبا کا معترف
بے وطن ہوں پر نہیں خانہ خراب

کہہ رہی ہے کب سے میری بے حسی
ہوش مندی کا کریں گے احتساب

☆☆☆

قطعہ

دھوپ کی حدّت سے وہ کملا گئے
جو نگاہوں میں بچا رکھے تھے خواب

انکشافِ ذات کا ہے مرحلہ
لکھ رہا ہوں پھر سے اک تازہ کتاب

کون سمجھے گا دنوں کی الجھنیں
کون جانے گا شبوں کا اضطراب

گن رہا ہوں کب سے میں سانسیں یہاں
کر رہا ہوں دھڑکنوں کا پھر حساب





یہ ملنگوں کو نہیں دیتا ہے زیب
کیوں کریں گے ہم بھی فکرِ نان و آب

جب لگا آسان کرنے زندگی
بن گئی تب اور بھی یہ اک عذاب

ہوگئیں راہیں میری تاریک تر
روشنی کا منتظر ہوں آفتاب

سب اِثاثہ لٹ چکا جب اے فریدؔ
اس کی محفل میں ہوئے تب باریاب





نفع و ضرر سے واسطہ مبہم نہیں ہوا
شیرازہ اپنی ذات کا برہم نہیں ہوا

میں حاشیہ نشیں ہوں کسی ذوالجلال کا
اب تک خمارِ گندم و جو کم نہیں ہوا

آنکھوں کی پتلیوں میں مقیّد ہے کائنات
لیکن فشار ذات سے محرم نہیں ہوا

اپنی طلب کا جس کو میں حاصل بتا سکوں
اب تک عطا مجھے وہی عالم نہیں ہوا

گردن کشی پہ تُل گیا وہ خنجر پُر آب
سارا لہو یہ چھاٹ کے بیدم نہیں ہوا

محفوظ میرے ذہن میں دھندلے نقوش ہیں
میں رفتہ گاں کی یاد میں محکم نہیں ہوا

کیسے بھلا سکے گا تیری صحبتیں فریدؔ
اے ہاشمی[1] خلوص میرا کم نہیں ہوا

---

1. پروفیسر قاضی عبیدالرحمن ہاشمی - جامعہ ملیہ اسلامیہ (دہلی)



دورانِ گفتگو نیا پہلو نکل پڑے
میں آپ کہنا چاہوں مگر تو نکل پڑے

اب تیرہ روز گار کسے ہم نوا کریں
دن کی تلاش میں سبھی جگنو نکل پڑے

وہ موجۂ گلاب جو گلشن میں کھو گیا
ممکن ہے زیرِ سایۂ گیسو نکل پڑے

جب یاد آئیں اپنی تساہل پسندیاں
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

صیقل پسند بھولتے جاتے تھے اپنا آپ
خود کو تلاش کرنے لبِ جو نکل پڑے

تیری گلی میں سیکھا ہے درسِ یگانگی
اب منہ سے کیسے حرف من وتو نکل پڑے

آئی ہے یاد تیرہ نصیبوں کی اُس لیے
لے کر چراغِ چہرۂ نیکو نکل پڑے

جو تیر اس نظر کا ہوا تھا خطا کبھی
وہ کیوں نہ میرے دل میں ترازو نکل پڑے

غم کے سوا فریدؔ یہاں اب بچے گا کیا
خوشیاں وہ جھاڑنے لیے جھاڑو نکل پڑے





سکندر ہوں تلاش آبِ حیواں روز کرتا ہوں
ابھی نقش و نگارِ زندگی میں رنگ بھرتا ہوں

لگا کر سب لہو آخر ہوئے داخل شہیدوں میں
میں اپنی لاش رستے سے ہٹانے تک سے ڈرتا ہوں

پرانی آگ اگر ہوتی تو کب کی جل بُجھی ہوتی
میں ہنستے کھیلتے موجِ حوادث سے گزرتا ہوں

یقیناً موت کے ہر عکس پر وہ خاک ڈالے گا
دعا سے جس کی میں اب تک نہ جیتا ہوں نہ مرتا ہوں

کبھی میری طلب کچے گھڑی پر پار اُترتی ہے
کبھی محفوظ کشتی میں سفر کرنے سے ڈرتا ہوں

تمہارا اِذن ہو حاصل تو دریا راستہ دیں گے
جہاں فرعون ڈوبا تھا وہیں پر پار اُترتا ہوں

فریدؔ اُس کی طلب اکثر جھنکائی ہے کیوں مجھ کو
وہ چہرہ جس کی چاہت میں، میں کیا کیا گزرتا ہوں





کئی دنوں سے محبتوں کی فضا ہے ناخوشگوار جاناں
نظر نظر میں ہوس ہے باقی نہ نکلا دل کا غبار جاناں

میں منہدم خواہشوں کا ملبہ لیے پھرا ہوں تمام جگ میں
اس اک خلش نے کیا ہے غارت متاعِ صبر و قرار جاناں

وجود میرا بکھر چکا ہے خرد کے گھر سے جنوں کے در تک
قدم قدم پر ہوں دفن میں ہی جگہ جگہ ہے مزار جاناں

میں شوق و رغبت کی دلدلوں میں پھنسا ہوا ہوں، میں پا بگل ہوں
ابھی تلک بھی سمجھ رہا ہوں میں جبر کو اختیار جاناں

میں ایک سایہ ہوں شائبوں کا کہ واہمہ ہوں میں ذائقوں کا
کہاں تلک میں چھپاؤں خود سے ہے یہ شوقِ ناپائدار جاناں

عجیب منطق مری طلب کی کبھی تعلق کبھی گریزاں
یہ شوقِ خستہ کرے گا کب تک اِسی پہ انحصار جاناں

کمند ڈالی اُسی ادا پر، لگا ہے مژگاں کا تیر دل پر
شکار کرنے چلا تھا لیکن ہوا ہوں خود ہی شکار جاناں

مکین دِلّی ہوا ہے شہپرؔ، گیا ہوا ہے اسعدؔ بھی اب بدایوں
فریدؔ تنہا گزارتا ہے اب اپنے لیل و نہار جاناں



ا۔ شہپر رسول ۲۔ اسعدؔ بدایونی



قلب ونظر کا مسئلہ یوں حل طلب بھی ہے
اے دل تیری تباہی کچھ اپنا سبب بھی ہے

واپس نہ آسکو گے جو گھر سے نکل پڑے
راہیں شکستہ ہی نہیں تاریک شب بھی ہے

ہر شب جلا کے رکھتا ہوں دہلیز پر چراغ
شاید کہ لوٹ آؤ گے اُمید اب بھی ہے





کسی پہ یوں نہ کرو اعتبار میری طرح
لٹا کے بیٹھو گے صبرو قرار میری طرح

سمندروں سے بھی لوٹے جو تشنگی لے کر
سمیٹے ہیں وہ اب تک پھوار میری طرح

ابھی تو ہوتی ہیں سرگوشیاں ہیں دیوار
ابھی نہ کرنا ستارے شمار میری طرح

بگولہ بن کے اُڑا خواہشوں کے صحرا میں
ٹھہر گیا تو فقط تھا غُبار میری طرح

اُنہیں کے سایوں میں اب سر جھکا کے چلتا ہے
اُگا گیا تھا جو سرو و چار میری طرح





کشتیِ جاں ہوگئی بے بادباں
اے ہَوا اس طور مت لے امتحاں

آؤ کھیلیں ہم بھی مل کر دھمال
جو نہ ہونے کو تھا وہ ہوگا یہاں

کچھ ترحّم چاہیے اے اَبر تر
جل گئیں میرے وطن کی کھیتیاں

خود کو بھی بھولا ہوں اب کی باری میں
تجھ کو بھی اب یاد آؤں گا کہاں

یہ نہیں پہچان سکتا ہوں میں اب
تھا کہاں پر شہر میں میرا مکاں

جو اُٹھا لایا ہوں کوئے یار سے
سر پہ ہے اب تک وہی بارِ گراں

بچ نکلنے کو کوئی امکاں نہیں
چاروں جانب ہے حصارِ دشمناں

ہوں اسیرِ دامِ الفت اے فریدؔ
من نمی دانم فلاں ابن فلاں





ہمہ جہت مری طلب جس کی مثال اب نہیں
تیرا خیال ہے مگر اپنا خیال اب نہیں

شوق کا بحرِ بے کراں، محوِ سکوت جاوداں
اس میں نہ کوئی جوش اب اس میں اُبال اب نہیں

غم کی زمیں پر آسماں باقی رہا نہ اے میاں
دل کی یہ سوگواریاں روبہ زوال اب نہیں

اب نہ حریم ناز سے ہوگا طلوع آفتاب
قرب جمال تو گیا لطفِ وصال اب نہیں

دُور سے رہ حبیب کی بات یہ ہے نصیب کی
جینا محال ہوگیا مرنا محال اب نہیں

رقص کناں ہے واں ہوس اِس پہ رہی نہ دسترس
حسنِ مطیع ساکنِ شہر جمال اب نہیں

تیرے کرم پہ جی رہی کب سے ہے میری کج روی
کوئی جواب اب نہیں کوئی سوال اب نہیں

لے کے نئی نئی غزل آہی گئے فریدؔ اب
سن اے چراغِ انجمن تیرا زوال اب نہیں



تمنا اپنی اُن پر آشکارا کر رہا ہوں میں
جو پہلے کر چکا ہوں اب دُوبارا کر رہا ہوں میں

شکستِ آرزو، عرضِ تمنّا، شوقِ لا حاصل
تری خاطر تو یہ سب کچھ گوارا کر رہا ہوں میں

قفس میں جی بہلنے کے لیے وہ پھول رکھ آئے
ہجومِ یاس میں جن پر گزارا کر رہا ہوں میں

غرض اُس چیز سے مجھ کو نہیں میری نہ جو ہوگی
یہ باعث ہے کہ دنیا سے کنارا کر رہا ہوں میں

میں کھل کر کہہ نہیں سکتا نیازِ عشق کی باتیں
فقط اُن کی طرف بس اک اشارا کر رہا ہوں میں

مرے سر پر ہے باقی ایک سایہ میرے ماضی کا
سنبھل کر عصرِ حاضر کا نظارا کر رہا ہوں میں

فریدؔ اک دن سہارے زندگی کے ٹوٹ جائنگے
سبب یہ ہے کہ خود کو بے سہارا کر رہا ہوں میں





خستہ جاں پا بسز کارِ رائگاں ہونے کو ہے
جمع خار و خس برائے آشیاں ہونے کو ہے

زندگی کی حیرتوں میں پھر اضافہ ہو گیا
تھی جو ہونے کی توقع وہ کہاں ہونے کو ہے

سونپ کر جس کو چلا تھا میں نگہہ داری کا کام
وہ بھی محوِ سازشِ تیر و کماں ہونے کو ہے

واپسی کے راستے بھی ہو گئے مسدود سب
اور مرے جی کو بھی احساسِ زیاں ہونے کو ہے

ساحلوں سے باندھ اپنی کشتیاں تو بھی فریدؔ
پھر سے برگشتہ ہوائے بادیاں ہونے کو ہے





سینے پہ بوجھ، سانس رُکی دل ہے تنگ تنگ
بے طرح اب کے جسم میں برپا ہے ایک جنگ

اکثر دکھا رہا تھا مجھے آسماں کے خواب
آخر گیا زمیں پہ پٹک کر وہ بے درنگ

رنگوں کے ازدحام میں تحلیل ہو نہ جاؤں
حالات بدلے جاتے ہیں گرگٹ کی طرح رنگ

ایسے بھی حادثات وفا میں گزر گئے
پھولوں میں جب لپیٹ کے بھیجے ہیں اُس نے رنگ

ہر شہر ہر نگر مری منزل بنا گیا
آزاد مجھ کو کر گیا جیسے کئی پتنگ

گوہر مراد کا کہیں کھو کر نہ لوٹنا
ہر جوئے آب ہوتی نہیں خالی از نہنگ

شاید تیری نگاہ سے گرنے لگا ہوں میں
اپنے وجود سے مجھے آنے لگا ہے ننگ

اہلِ کرم کے طور سے بیگانہ مت کہو
دیکھے ہیں میں نے چشم مروّت کے سبھی رنگ

شاید ڈبو کے جائیں گی طغیانیاں فریدؔ
خالی نہیں فساد سے دل کی کوئی ترنگ





اسیر پنجۂ رنج و تعب میں رہتا ہوں
میں تجھ سے دور سہی دور کب میں رہتا ہوں

بھلا رہا ہوں اُسے جس کو یاد رکھنا ہے
عجب طرح سے غم بے کسب[1] میں رہتا ہوں

میں تب سے اپنے لیے گھر نہیں بناتا ہوں
کھلا یہ جب سے کہ دار الحرب میں رہتا ہوں

تمام دن وہ دعا دے رہے ہیں جینے کی
میں اپنے قتل پہ آمادہ شب میں رہتا ہوں

رہِ حیات میں زادِ سفر تیری یادیں
میں تجھ سے دور سہی دور کب میں رہتا ہوں

ہر ایک ظرف کے وہ احتساب میں ہے فریدؔ
یہ اور بات کہ اہلِ نسب میں رہتا ہوں

---

[1] شعری ضرورت کے تحت وتد مجموع گردانا گیا ہے۔ فریدؔ



فرصت جو ملے خود سے ملاقات بھی ہوگی
دیوار کے سایوں سے نئی بات بھی ہوگی

پیاسا جو پلٹ آؤں وہ ہے اپنا مقدر
طے مجھ سے یوں تو منزلِ ظلمات بھی ہوگی

ہاری ہوئی سرحد پر ڈٹا اِس لیے ہوں میں
جیتے ہوئے دشمن کی بھی مات بھی ہوگی

قطعہ

اس درجہ بڑھیں گے کبھی اخلاص کے رشتے
جو بات نہ کہنے کی ہے وہ بات بھی ہوگی

ناچے گا کبھی مور ترستے ہوئے دل کا
اک دن ترے الطاف کی برسات بھی ہوگی





شکستہ پیکروں میں رنگ بھر آ گیا ہوگا
ہوا کے ایک جھونکے سے بکھرنا آ گیا ہوا

سنا ہے ہر تقاضا نو بہ نو سانچہ بدلتا ہے
جو کرنے کی نہ تھی خواہش وہ کرنا آ گیا ہوگا

ہنر سب زیست کرنے کے وہ یکسر بھول بیٹھا ہے
نہ جینا آ گیا ہوگا نہ مرنا آ گیا ہوگا

بڑا چالاک ہے وہ شخص ہر گُر جانتا ہے وہ
بھرے چوپال پر اس کو مکرنا آ گیا ہوگا

سنا تھا میں نے وہ پانی پہ چل کر پار اُترے گا
سفینے ڈوبتے دیکھے ہیں ڈرنا آ گیا ہوگا





بیتاب، بے قرار، مزاجاً کرخت تھا
شاید مرا رفیق بھی ایک شیر بخت تھا

تیار تھا نہ کوئی بھی ہونے کو ہمسفر
باندھے ہوئے اگرچہ سفر کا میں درخت تھا

کرتا نہ کیوں میں دعوتِ مژگان کا اہتمام
دل خون خون تھا تو جگر لخت لخت تھا

تازہ ہوا سے رشتہ موسم تو تھا ضرور
بے برگ و بار دل کا مگر ہر درخت تھا

بھرتا وہ کس طرح مرا کشکول مہربان
اُس کو ہے یہ خبر میں سرِ تاج و تخت تھا

کیا بات ہے فریدؔ تجھے چپ ہے کیوں لگی
لوگوں میں نامور تو یہاں جانِ سخت تھا





نیندوں کا قحط خواب کی ارزانی بڑھ گئی
تجھ سے بچھڑ کے اور پریشانی بڑھ گئی

جب سے چراغ یاد بجھا اے ہوائے شام
جینا محال ہوگیا ویرانی بڑھ گئی

چاہِ حیات پر جو سکندر پہنچ گیا
خستہ تنوں کے دیکھ کے حیرانی بڑھ گئی

شاہِ زمن کو دستِ ہنرور ہوا سپرد
آدابِ آب زر سے تن آسانی بڑھ گئی

ہر کاغذی بدن کو ہے دعویٔ رنگ و بو
ذوقِ ریا میں طرزِ گل افشانی بڑھ گئی

اُس مضطرب مزاج سے حصّہ طلب کرو
ہنگامۂ حیات کی یکسانی بڑھ گئی

جب سے یہاں پہ رسم لباسوں کی چل پڑی
تب سے وہاں پہ خواہشِ عریانی بڑھ گئی

طالب نہ داد کا ہے ترا اب سخن فریدؔ
حد سے تحریرِ خامہ لافانی بڑھ گئی



اُجاڑ بستی نگر ہے ویراں
مکین برباد گھر ہے ویراں

اُداس شام اور سحر ہے ویراں
بہت دنوں سے سفر ہے ویراں

یہ اُن دیاروں سے پوچھ لینا
جہاں پہ ایک اک بشر ہے ویراں

لباس ہے سلوٹوں سے عاری
پہ دل کا تیور مگر ہے ویراں

شبیہِ خواب و خیال کی ہے
اُداس چہرہ نظر ہے ویراں

فریدؔ خوابوں کے قافلے کا
ہر اک شریکِ سفر ہے ویران





نفاستوں کا لبادہ اُتار کر آیا
برنگِ بوئے چمن خود کو ہار کر آیا

تجھے یقین نہیں ہے، تو اپنے آپ سے پوچھ
بچا کے لایا جسے بھی وہ وار کر آیا

وہ حق پرست نہ تھا عاقبت کا سودائی
ہوائے دیر پہ مجھ کو سوار کر آیا

ملا بھی کیا اُسے جزیاس و درد و ناکامی
گلی گلی میں تجھے جو پکار کر آیا

کبھی یہ پوچھنا فرصت میں موجِ طوفاں سے
وہ کس طرح سے سمندر کو پار کر آیا

میں گرد گرد صداؤں کے آسرے پہ فریدؔ
زیاں رسید بگولے شمار کر آیا

☆☆☆



جب حدِ ادراک پھاندوں بے کراں کہنا مجھے
خالی از اندیشۂ سود و زیاں کہنا مجھے

ایک سے لگنے لگے ہیں مجھ کو سارے ہی دیار
نگہتِ گل کی طرح اب لامکاں کہنا مجھے

سوکھی دھرتی کی زباں پر رکھ کے حرفِ العطش
کس طرف جاتا ہے اے ابرِ رواں کہنا مجھے

مت سمجھ میری خموشی کو مری مجبوریاں
بھا گیا کب تیرے منہ سے داستاں کہنا مجھے

سایہ سایہ جمع کرنا روز کا معمول ہے
وحشتوں کے شہر کا اک ترجماں کہنا مجھے

جب حصارِ رنگ سے نکلوں میں آگے اے فریدؔ
چاہتوں کے لفظ و معنیٰ کا بیاں کہنا مجھے

☆☆☆



دہرا رہے ہو گزرے ہوئے واقعات پھر
غارت کرو نہ میرا سکونِ حیات پھر

اے وقت آ کے پونچھ اب اشکِ رواں کی دھار
مجھ کو رلا رہے ہیں وہی حادثات پھر

ریگِ ہوس سے بھرتا ہوں دامن اُمید کا
ملنے سے رہ گئی ہے تمنّا کی رات پھر

شاید کہ زندگی کو ہے مجھ سے کوئی گلہ
تاریک کیوں نظر میں ہوئی کائنات پھر

اس بار اُس سے مل کے میں حیران پھر ہوا
اس بار دے گیا وہ غمِ بے ثبات پھر





بنے بنائے سے رشتوں کو ڈھا گئی ہے ہَوا
تمام نقشِ کفِ پا مٹا گئی ہے ہَوا

کہیں پہ سبزہ نہ کوئی نشان پانی کا
نجانے لے کے کہاں مجھ کو آ گئی ہے ہَوا

کہاں پہ ٹوٹ گیا ہوں مجھے یہ فکر نہیں
میں سوچتا ہوں کہاں سے گرا گئی ہے ہَوا

کہاں سے مانگ کے لاؤں ضیا میں گھر کے لیے
سبھی گھروں کے دیئے جب بجھا گئی ہے ہَوا

خیال و خواب کے تتلی پروں کو روتے ہیں
اُداس صحن میں فتنے جگا گئی ہے ہَوا





عہد جنوں کے روز و شب یوں بھی کبھی گزرنا
مارے تجھے جو سنگ کوئی تو بھی اُس پہ مارنا

راہِ طلب میں گر کہیں درد کی اک کرن ملے
پلکوں کی رہ گزار سے دل میں اُسے اُتارنا

محوِ سخن تو خود سے رہ اور یقینِ صبح رکھ
زلفِ شبِ فراق کو یوں بھی کبھی سنوارنا

نیند کے قافلے چلو ڈھونڈ لیں پھر نگر نگر
خوابوں کے عکس عکس کو جاگتے ہیں پکارنا

چاہے اگر یہ دل ترا پھول نئے ہوں باغ میں
پچھلی رُتوں کے پہلے تم قرضے سبھی اُتارنا





ہر راہ میں لٹایا سامان زندگی کا
نکلا نہ کوئی اب تک ارمان زندگی کا

وہ ریت کے گھروندے اب ڈھونڈوں کہاں پر
ڈھا کر چلا ہے جن کو طوفان زندگی کا

آخر اُسے بھی پایا ہارے ہوؤں میں میں نے
جیتا ہوا تھا جس نے میدان زندگی کا

مجھ کو دعا یہ دے کر اک شخص جا چکا ہے
آسان نہ چھوٹنا ہو دامان زندگی کا

اک راہ زن کو میں نے جب ہم سفر بنایا
تب ہو گیا سفر کچھ آسان زندگی کا

کم ظرف محسنوں نے کہلا یہ مجھ کو بھیجا
ہر معرکہ ہے اب کے گھمسان زندگی کا

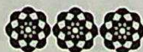
☆☆☆



پُر کیف ساعتوں کے حسین خواب لے گیا
صبر و شکیب نیند کے اسباب لے گیا

یہ حادثہ بھی ہوگا چمن میں نہ تھا یقیں
پھولوں کا رنگ اوس کا سیلاب لے گیا

اُس رہ گزر میں کس نے دیا ہے کسی کا ساتھ
جس سمت مجھ کو یہ دلِ بیتاب لے گیا



وہ قہقہوں سے بنھاتا ہے رسم زندہ دلی
ہر ایک شخص کو وہ خوش نصیب لگتا ہے





بوئے گل محوِ بے کرانی ہے
رنگ موسم کا داستانی ہے

بارشِ سنگ وادیوں پہ ہوئی
فصل پر قہر آسمانی ہے

اُس جگہ تم نے مجھ کو چھوڑ دیا
جس جگہ سبزہ ہے نہ پانی ہے

اب سلامت مکان ہے نہ مکیں
کیا یہی تیری پاسبانی ہے

جانے کس سمت لے چلے گی مجھے
اک ہَوا ساتھ بادبانی ہے

اب تو کم کم ہی بولتے ہو فریدؔ
جانے کیا تم نے دل میں ٹھانی ہے

☆☆☆



آندھی چلی درخت سبھی اوندھے منہ گرے
سایوں کی جستجو میں مگر اِک فقیر تھا

شاید بغیر سیج وہ سویا تھا رات بھر
اُس کے تمام جسم پر نقشِ حصیر تھا

نکلا تھا گھر سے ڈھونڈنے وہ اپنے آپ کو
شاید یہی گناہِ گناہ کبیر تھا



صحرائے خشت وسنگ میں آواز کس کو دوں
شہر سکوں میں بڑھنے لگا اضطراب سا





خریدوں گا میں اب سایہ کہاں پر
کہ بکتی دھوپ ہے ایک اک دکاں پر

کرایہ دار سے ہوشیار رہنا
کہیں قابض نہ ہوجائے مکاں پر

تہہ دیوار سائے گم ہوئے سب
بہت حیران ہوں اِس داستاں پر

ہوا تو لے اُڑی برگ و شجر تک
یہ کیسا وقت آیا گلستان پر

وہ اُس کی خواہش تسخیر اللہ!
کمندیں ڈالتا تھا کہکشاں پر





اُس بے وفا سے اب کے محبت نہیں رہی
وہ دِل نہیں رہا وہ طبیعت نہیں رہی

ویرانیِ حیات کا یہ کیا مقام ہے!
لگتا ہے مجھ کو تیری ضرورت نہیں رہی

آگے کی راہ گھیر لی سرکش ہواؤں نے
واپس بھی لوٹ جانے کی صورت نہیں رہی

رکھتا ہوں اب تو خود سے حریفانہ کشمکش
اپنوں سے کوئی وجہ کدورت نہیں رہی

وحشت نے آلیا ہے درو بام کو فریدؔ
کس سے کہوں کہ گھر کی وہ حالت نہیں رہی





بطرزِ خاص ستم جو حنا حنا سا لگا
اُسی سے درد کا رشتہ سجا سجا سا لگا

سلگتے خواب خریدے ہیں نیند کے بدلے
یہ کارو بار پرانا نیا نیا سا لگا

اُلجھ گئے ہیں پرندوں کے شاخ شاخ سے پَر
نئی فضاؤں کا لہجہ سزا سزا سا لگا

وہ نقشِ لوحِ وفا پر بھی جاوداں نہ ہوا
اگرچہ حرفِ جدائی مٹا مٹا سا لگا

فضول درد چھپانے کی کوششیں تھیں فریدؔ
زبانِ حال سے سب کچھ کہا کہا سا لگا





تعلقات کشیدہ وہ جوڑنے نکلا
اُسی نگر میں مجھے لا کے چھوڑنے نکلا

بطورِ تحفہ ملی سیج زرد پتوں کی
لہو جو اپنا گلستاں میں چھوڑنے نکلا

جنوں کا جس کو سہارا بفیضِ عشق ملا
کلائیاں وہ خرد کی مروڑنے نکلا

حصارِ وقت نے خود اس کو گھیر رکھا ہے
میں کس سے رشتۂ اخلاص جوڑنے نکلا

یہ کیا کہ فتنہ کوئی راستوں میں ساتھ لیے؟
تمام شہر کو پاگل جھنجھوڑنے نکلا

جو بے گناہ پرندوں کو قید کرتا تھا
قفس وہ آج سرِ راہ توڑنے نکلا

☆☆☆



صعوبتِ شب غم سے بہت نڈھال ہوئی
ترے بغیر مری زندگی محال ہوئی

جہاں قریب سبھی کچھ ہے فرصتوں کے سوا
اُسی مقام پہ اب وہ شریک حال ہوئی

ابھی تلک ہے سرِ راہ گزار خاک بسر
وہ آرزو جو کشاکش میں پائمال ہوئی

مثال موجِ بلایاں چلے ہے موجِ جنوں
تیری گلی بھی زمانے میں بے مثال ہوئی

خوشی کی ایک رمق وہ جو دل میں باقی تھی
ہزار غم کے مقابل میں بڑھ کے ڈھال ہوئی





تاریک مناظر کو بدلتا ہوں اکیلا
مرقد کا دیا بن کے میں جلتا ہوں اکیلا

مانا کہ مرے پاؤں لہو رنگ ہوئے ہیں
حالات کے کانٹوں کو مسلتا ہوں اکیلا

غالب نہیں احساس بھی پس پائی کا مجھ پر
ٹھوکر سے جو گرتا ہوں سنبھلتا ہوں اکیلا

ہر شام ممکن ساتھ لیے لوٹتا ہوں گھر
ہر صبح کسے ڈھونڈنے چلتا ہوں اکیلا

پُر کیف فضاؤں سے فریدؔ اب یہ کہے کون
تپتے ہوئے صحراؤں میں پلتا ہوں اکیلا





نہ پوچھو کس طرح اب تک جلا ہوں
ہوا کے دوش پر میں اک دِیا ہوں

خفا مجھ سے ہیں سارے سونے والے
خطا میری یہی ہے جاگتا ہوں

کھڑا رستے میں ہوں پلکیں بچھائے
تیری آمد کے چرچے سُن رہا ہوں

زمانہ ہی نہیں واقف ہے مجھ سے
زمانے سے مگر میں آشنا ہوں

کسی دامن نہ آنچل ہی کا سایہ
ہواؤ کس نگر میں آگیا ہوں

مجھے غم ہے اگر تو بس یہی ہے
کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں لٹ گیا ہوں

یہ دنیا پڑگئی ہے میرے پیچھے
میں بگ ٹٹ اس لیے بھی دوڑتا ہوں

☆☆☆



لہو لہاں تمنّاؤں کا چمن ہے ابھی
تمہاری یاد کے پہلو میں بانکپن ہیں ابھی

نجانے کون سا الزام لوگ دیں گے اب
نظر نظر میں تقاضوں بھری چُھبن ہے ابھی

تلاش کرتا ہوں میں خود کو گھر کے گوشوں میں
تمام جسم میں بے نام سے تھکن ہے ابھی

کدھر کو جائے گی دم لینے جنگلوں کی ہوا
چہار سمت درختوں سے اک گھٹن ہے ابھی

بدن کے داغ فریؔد اب چھپیں تو کیسے چھپیں
کہ تار تار سبھی میرا پیرہن ہے ابھی





سانس لینا عذاب ہے بابا
لمحہ لمحہ خراب ہے بابا

پھر وہی مرحلہ ہے پیش نظر
پھر وہی اضطراب ہے بابا

وہ کریدے ہے راکھ چولہے کی
اور نگاہوں میں خواب ہے بابا

میں کہ مثل غبار صحرا ہوں
تو سراسر سحاب ہے بابا

وہ جو دھونی رمائے بیٹھا ہے
کوئی پوچھے جواب ہے بابا





رنج کی بات کررہے ہیں لوگ
حد سے آگے گزر رہے ہیں لوگ

کھوج میں موتیوں کے نکلے تھے
خاک دامن میں بھر رہے ہیں لوگ

چھوڑ جاتے ہیں دِل میں گہرا غار
چھب دِکھا کے گزر رہے ہیں لوگ

سبز صحرا میں منتظر رکھ کر
وعدہ کر کے مکر رہے ہیں لوگ

جانے ہو کر کہاں سے آیا دِن
اپنے سارے سے ڈر رہے ہیں لوگ





دیوار کیا ایک در نہ رکھا
اب شہر میں کوئی گھر نہ رکھا

اشجار ہوا نے رکھّے باقی
شاخوں پہ کوئی ثمر نہ رکھا

کرتب یہ ہوا نے کر دکھایا
فانوس چراغ پر نہ رکھا





وہ رہ گزار تمنا سے چوٹ کھا کے گیا
سکوتِ دشت میں اِک شور و غل مچا کے گیا

زمیں پہ چاند ستارے بکھیرنے والا!
نجانے کیوں مرے گھر کا دِیا بجھا کے گیا

شریر بچوں نے نوچے تھے تتلیوں کے پَر
اِسی سے ملتی کہانی کوئی سنا کے گیا

اُداسیوں کے پرندے منڈیر پر رکھ کر
خموشیوں کے شجر صحن میں اُگا کے گیا

گزر کے اَبر کی صورت میں وہ بستیوں سے فریدؔ
نظر نظر میں عجب تشنگی بسا کے گیا





داوٗ عدو نے وہ مار گئے ہیں
جیتی بازی ہار گئے ہیں

میرا سفینہ بیچ بھنور میں
تیرنے والے پار گئے ہیں

کند تھے اپنے تیغ و تبر ہی
خالی سارے وار گئے ہیں

طالبِ آب ہوئے تھے پیاسے
تیر دہن پر مار گئے ہیں





سلگ رہا ہوں اِسی تجسّس میں چاہنے کے اصول کیا تھے
تمہارے بالوں میں کل بتاؤ گلاب کے سرخ پھول کیا تھے

تھکا تھکا ایک اِک مسافر کہاں کی منزل کدھر کے راہی
بچھڑ کے خود سے اگر ملے ہیں تو پھر یہ اتنے ملول کیا تھے

یہ حال ہے دِل گرفتگی کا کوئی ہے غمگین کوئی فسردہ
اُتر گیا ہے دماغ و دِل سے مسافتوں کے اصول کیا تھے

کبھی متاعِ چمن وہی تھے کبھی تھے سامانِ صد بہاراں
نئی فضا نے کئے ہیں بے پر پرندے ورنہ فضول کیا تھے





سانس رُکے ہے جی مچلے ہے حال ہمارا اب کیا ہوگا
دل کی باتیں کون سُنے ہیں بوجھ یہ کیسے ہلکا ہوگا

ہم سے بے زَر لوگ کہاں ہیں وہ تو دھنی کہلاتے ہیں
مال و متاع کے لُٹ جانے کا جن کو یارو خدشہ ہوگا

جیون اُجڑا، راتیں اُجڑیں، دِن بھی سونے سونے ہیں
روگ لگا ہے جی کو ایسا جو نہ کبھی بھی اچھا ہوگا

ڈھونڈ رہا تھا ان کو شاید گھر کے اُجڑے گوشوں میں
سودو زیاں کا زینہ چڑھتے جن لمحوں کو کھویا ہوگا

گھر میں اُتنے فتنے جگے تھے خود کو یاد نہ آیا ہوں
میرے بارے اَب کے ساوَن تم نے کیا کیا سوچا ہوگا

کچھ بھی نہیں ہے جُز نقالی بات بنے گی کیسے فریدؔ
کاری چوٹ لگے جب دِل پر میر کا جیسا لہجہ ہوگا



گم گشتگی پہ مائل فریاد بھی نہیں
کِن راستوں سے آیا یہاں یاد بھی نہیں

واضح معاملات ہوں شب خوں کے کس طرح
کوئی نشان ریت پر آباد بھی نہیں

جلتے نگر کا سب نے تماشا کیا مگر
میرے سوا کسی کو وہ دِن یاد بھی نہیں

دِن زندگی کے ایسے گزرتے ہیں اے فریدؔ
دِل شاد گھر نہیں ہے تو ناشاد بھی نہیں





فتنۂ ماہ و سال ہے شاید
شہرِ دِل پائمال ہے شاید

عمر گذری ہے جس کو سلجھاتے
دِل کو الجھا سوال ہے شاید

قریہ در قریہ ڈھونڈتا ہوں جسے
گم شدہ اِک خیال ہے شاید

مجھ سے ملنے یہ کون آیا ہے؟
لمحۂ لازوال ہے شاید

گھر کا دروازہ جسے بند ہوا
کسی مکڑی کا جال ہے شاید





آشنائی کا صلہ عیّار سے کیا مانگتا
سایہ میں ٹوٹی ہوئی دیوار سے کیا مانگتا

ٹولیاں وہ پنچھیوں کی رنگ رنگ اور پُرکشش
اُڑ گئیں کس سمت وہ اشجار سے کیا مانگتا

چند مہمل لفظ تھے کس سے وہ ہوتا ہمکلام
گونگا شہری پھر لبِ اظہار سے کیا مانگتا

دھوپ اُتری بام و دَر سے راستے سونے لگے
کیا ہو انجامِ سفر رفتار سے کیا مانگتا

کیوں بلندی کے تصوّر کو نہ چھوڑ آتا فریدؔ
واقفِ معیار تھا کردار سے کیا مانگتا





بوجھل ہے آنکھ نیند سے گھر سوچنے لگے
شب کس جگہ کہاں ہو سحر سوچنے لگے

اِس آرزُو میں روتے ہوئے عمر کٹ گئی
کب معتبر ہو دیدۂ تر سوچنے لگے

دامن میں کیوں مرے وہ خس و خار بھر گئے
اوروں کو کیوں دیئے ہیں ثمر سوچنے لگے

اَن دیکھی وادیوں کا جو در پیش ہے سفر
کیسے ملے گی راہ گزر سوچنے لگے

شعلے لیے بہار جو آئی تو ہم فریدؔ
کیا ہوگا رنگ و بو کا اثر سوچنے لگے





حرفِ امکاں منجمد ہے پتھروں کے درمیاں
اِک ِ زمرّد پوش منظر بنجروں کے درمیاں

چل دیا کس سمت وہ اسپِ ضیاء کا شہسوار
کر کے مجھ کو قید تیرہ منظروں کے درمیاں

بھول بیٹھا ہوں میں اَب خارہ شگافی کا مزاج
چین آتا ہے مجھے شیشہ گروں کے درمیاں

بے بسی کی وسعتیں شاید سمجھ میں آگئی
ڈھونڈتا ہوں اَب میں گھر اُجڑے گھروں کے درمیاں

ٹوٹتی دیوار کا سایہ بھی آخر چھن گیا
زندگی سُستا رہی ہے خنجروں کے درمیاں





خوں گشتہ خواہشوں کا وہ اثبات کر گیا
اچھا ہوا کہ شکوہٗ حالات کر گیا

سمجھا بُجھا کے خود کو وہ لایا ہے راہ پر
دنیا سمجھ رہی ہے کرامات کر گیا

کشکول ہاتھ میں لیے بابا بھی چل دیا
بستی میں کون پاسِ روایات کر گیا

بستی کے سارے لوگ گھروں سے نکل پڑے
یہ کون زلزلوں کی یہاں بات کر گیا

اے روشنی طبع ذرا اُن کا ساتھ دے
برباد جن کو شوقِ ملاقات کر گیا





باد و باراں جو بے پناہ ہوئے
نو دمیدہ شجر تباہ ہوئے

جن کی زنبیل میں ہیں شمس و قمر
ساتھ ہم اُن کے گاہ گاہ ہوئے

چند لمحات تھے جو حاصلِ زیست
وہ سبھی صرفِ اشکِ وآہ ہوئے

ہم کہ محروم ہیں چراغ سے بھی
وہ کہ سورج کے بادشاہ ہوئے

شب کو دیکھا تھا خواب میں ہم نے
مشتعل سائے داد خواہ ہوئے





شجر حجر کو رہینِ عذاب کہلوں گا
میں بھاگتے ہوئے سایوں سے خواب کہلوں گا

بچا سکوں تو بچا لوں انا گزیدہ وجود
امیرِ شہر کو خانہ خراب کہلوں گا

ورق ورق یہ حقیقت غریقِ آب کروں؟
کہ بے بھروسہ ہے دِل کی کتاب کہلوں گا

سڑک سڑک نہ بچھایوں وجود خستہ مرا
بچھڑنے والے کسے ہم رکاب کہلوں گا

خزاں رسیدہ کلی ہی سہی جو ہاتھ لگے
میں خود فریب ہوں تازہ گلاب کہلوں گا





وہ موسمی پرندہ نہ لوٹا ابھی تلک
ہے فرشِ راہ چشمِ تمنّا ابھی تلک

جس کی طلب مجھی سے بچھڑ کر چلی مجھے[1]
کچھ بھی لگی نہ ہاتھ وہ دنیا ابھی تلک

ہر سنگِ میل دیتا ہے اذنِ سفر مجھے
شاید اِسی سبب سے نہ ٹھہرا ابھی تلک

---

[1] علم کز تو ترا نہ بستاند
جہل زاں علم بہ بود بسیار (حکیم سنائی)





تجھ کو کیا دوں گا نہ خوشبو ہے نہ شبنم اور نہ رنگ
میرے دامن میں بجز موجِ ہوا کچھ بھی نہیں

بس کہ اپنوں ہی کے ہاتھوں سے ہوا ہے میرا قتل
لوگ کہتے ہیں کہ "تیرا خوں بہا" کچھ بھی نہیں

بادلوں کی دوستی میں لوگ پیاسے رہ گئے
آتے جاتے موسموں سے اَب گلہِ کچھ بھی نہیں

پر شکستہ ایک طائر سوچتا ہے دیر میں
دام و دانہ کے سوا باقی بچا کچھ بھی نہیں





جنوں کے پاؤں تلے چڑھتی سیڑھیاں نہ نکال
حصارِ باغ سے خوش رنگ تتلیاں نہ نکال

کہیں نہ راہ میں الجھن اُنہیں سے بڑھ جائے
گھروں سے ہاتھ میں خوابوں کی سونٹیاں نہ نکال

نہ جانے اہل ہوس کس نظر سے دیکھیں انھیں
بغیر پردہ تمنّا کی بیٹیاں نہ نکال

علاج درد میں اتنا نہ مر تو لذت پر
چھبی ہیں پاؤں میں تیرے جو سوئیاں نہ نکال

فساد ہو نہ بپا پھر سکوں کے ساحل پر
اداسیوں کے سمندر سے مچھلیاں نہ نکال

فریدؔ بیچ کے اپنا ضمیر سستے میں
چلی ہے رسم کہ آنگن میں لڑکیاں نہ نکال



نظمیں

دعا

میں گھر سے جب بھی نکلتا تھا
میرا بستہ میرے کاندھے پر
آویزاں ہوتا تھا اس طرح
جالے میں مکڑی ہو جس طرح
میری ماں مجھے جاتے جاتے
اکثر اِس حرفِ تر سے نوازتی تھی
"جا بیٹا تجھے علم کے زیور عطا ہوں"



آتے جاتے موسموں نے میرے ماتھے پر
تیس برس کا عنوان
ثبت کیا اور کر رہا ہے
بیج سے انکھوا پھوٹا
انکھوا شاخدار قصّہ سنانے لگا ہے
اور اب میں خود اپنے لیے
علم کے زیور مانگتا ہوں



اسپان من گم شدند

رواروی کے سلسلے نہ فکر خیر وذکر غم
رواروی میں کون کس کو پوچھ لے
رواروی میں کون کس کا بوجھ لے
میں اک اکیلا آدمی میرے حریف چارسو
میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف
فقط اُنھیں پڑی ہوئی کہ لوٹ لیں
فتح گاہ سے شکستہ خور غنیم کا
مال ومنال یہی ہے سب کی جستجو
میں اِک اکیلا آدمی حریفوں اور حلیفوں
کے درمیاں گرا پڑا امثالِ تیر گھڑا ہوا
تماشہ دیکھ کر خود کو کوستا
خود کو حوصلہ دینے میں منہمک
میں اک اکیلا آدمی
خود پہ طعنہ زن بھی ہوں
میں اِک اکیلا آدمی نہ ذِکر غم نہ فکر آبرو مجھے
میرے رقیب چارسو
میں اِک اکیلا آدمی کسی کا ساتھ دینے سے قاصر
کہ میرے گھوڑے گم ہوئے
میں اِک اکیلا آدمی میرے حریف چارسو
میں اِک اکیلا آدمی میرے حلیف چارسو



۱۸ اکتوبر ۲۰۰۵

کئی دنوں سے عجب وحشتوں نے گھیرا ہے
کہیں نہ آکے گرے سر پہ میرے چھت اپنی
اور اِس کے نیچے نہ دب جاؤں سب عیال کے ساتھ
میں اپنی آنکھوں سے دیکھوں بنے جو گت اپنی

کئی دنوں سے یہاں پر ہے سلسلہ یہ دراز
زمین ہلتی ہے سب برگِ خشک کی مانند
نگلتی جاتی ہے پیہم قوی جوانوں کو
مٹا رہی ہے جہاں بھر سے خاندانوں کو
ہر ایک شے کا یہاں انہدام ہوتا ہے
ہوا نہ آج تلک جو وہ کام ہوتا ہے
چنار ناچتے ہیں فیلِ مست کی صورت
سڑک بھی پاؤں تلے سے نکلتی جاتی ہے
مکان گرتے ہیں پیہم بس اک چھناکے سے
طیور شور مچاتے ہیں دم بہ دم لیکن
نشور ہوگیا برپا قدم قدم لیکن
میں کیا کروں کہ مرے ہاتھ میں نہیں کچھ بھی
پڑھا ہے میں نے مقدس کتاب میں اکثر
ثمود و عاد کی باتوں کے باب میں اکثر

تباہ ہوگئے سب کارِ سہل کے حامی
غریق ہوتی ہیں قومیں بھی آب میں اکثر
خطائیں ہوتی ہیں سر زد عتاب آتا ہے
عمل کے بعد عمل کا حساب آتا ہے
کئی دنوں سے عجب کشمکش سی جاری ہے
میں دیکھتا ہوں مسلسل عذاب زا منظر
مکان اپنے زمیں بوس ہوتے جاتے ہیں
مکیں کو اپنا مکاں ہی نگلتا جاتا ہے
زمیں بھی فصل کے بدلے دھواں اُگلتی ہے
مکاں کے بدلے سڑک ہے قیام گاہ اپنی
ابھی ہے وقت کہ ہم آگہی کے پروانے
عمل سے اپنے عتابوں کو راہ میں روکیں
بچائیں اپنے عمل سے بچے کچھے ملبے
بچائیں اَشکوں سے ہی کھیلتے ہوئے بچے
ابھی ہے وقت عمل ہم رکھیں گے پیشِ نظر
وگرنہ یہ بھی ہے ممکن زمیں کا قہر ہمیں
عذاب ایسا کہ الفاظ گنگ کردے گا
زمیں ہمارے لیے اور تنگ کردے گا



اداسیوں کے اختتام پر

میں سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اختتام پر

ترے تمام فیصلے ترے تمام مشورے
تری حماقتیں ترے تمام معرکے

یہ تلخ گھونٹ جام کیسے بن گئے
بلندیوں کے خواب کیسے چھن گئے

ہر ایک احتجاج نقش آب کی طرح
ہر ایک اعتمادِ عکسِ خواب کی طرح

یہ کیا مری نظر میں مجھ کو خوار کر دیا مجھے
بس ایک حرفِ حق نے بے وقار کر دیا مجھے

یہ سوچتا ہوں بے کسی کے نام پر
ہر ایک معرکہ کے اختتام

ایک نظم

اپنے والد کے نام

اے دنیا کی خیر کے طالب
اپنے لیے بھی خیر طلب کر
تیرے گھر کے بام و دَر کو
اہلِ قریہ چاٹ رہے ہیں
ثمرِ رقابت بانٹ رہے ہیں
تیرے بازو کاٹ رہے ہیں
اے دنیا کی خیر کے طالب
اپنے لیے خیر طلب کر



ایک نظم

یاد کے اُلجھے ہوئے دھاگے سے
کوئی سرا نہ ہاتھ آتا ہے
گاہ بنتا ہوں گیت وصلت کے
گاہ فرقت کی مار کھاتا ہوں

سرد شب کے اداس بستر پر
گامزن ہے غموں کا اِک شکر
مار لیتا ہوں میں کبھی میدان
یہ کبھی کاٹتے ہیں میرا سر

تیری یادوں کے سلسلے ہیں دراز
مجتمع ہوگئے نشیب و فراز!



حکایت حرف گر

گئے دنوں کی لاش کو اُٹھا کے بوڑھا گورکن
عرق عرق ہے جسم سب جبیں بھی ہے شکن شکن
یہ مرحلہ وہی سکھائے راکھ ملنے کے ہنر
یہ مرحلہ بھی دل شکن ہے پیرہن بھی تر بتر

نہ بے کراں ہوا کبھی یہ زندگی کا کارواں
نہ بے اُفق ہوا کبھی اداسیوں کا آسماں
میں زندگی کے کولھو میں ہوں بیل سا کسا ہوا
میں ایک جبر ہوں ہے میری زندگی بھی جبر
جو اپنے آپ سے ملوں تو ہوتی ہے مجھے گھٹن

اسے اگر ملوں کبھی تو بول دوں گا حال سب
کہ کاٹنے سے کٹ سکے ہیں کب یہ میرے روز و شب
بدل گئی یہ زندگی بدل گئے وفا کے ڈھب
محبتیں نہ نفرتیں نہ دریاں نہ قربتیں
کہاں گئے وہ رات دِن کدھر گئیں وہ فرصتیں

مرے قریب رہ کے بھی میرے قریب وہ نہیں
مرے رفیق وہ نہیں میرے حبیب وہ نہیں
ذرا ذرا سی الجھنیں ذرا ذرا سے اَڑ چنیں
یہ اِک وتیرہ پر نہیں گھے چناں گھے چنیں
اداسیوں کے بوجھ کے تلے دبا دِل حزیں

گئے دِنوں کی لاش کو اُٹھا کے بوڑھا گورکن
عرق عرق ہے جسم سب جبیں بھی ہے شکن شکن



متفرقات



بے برگ و نوا ہوں اُسے اتنا تو پتا ہے
پھر بھی مجھے گلشن کے لیے خطرہ لکھا ہے
آسیب زدہ شہر کی وہ اُجڑی سرا ہوں
مدت سے جہاں کوئی بھی آیا نہ گیا ہے

☆☆☆

وقت کے ساتھ ساتھ چلتا ہوں
پاؤں کی بیڑیاں بدلتا ہوں

☆☆☆

چلو کہ خود کو بدلنے کا تجربہ کرلیں
جو آج تک نہ کیا ہے وہ معجزہ کرلیں

☆☆☆

اپنے اطراف و جوانب سے یہ غافل ٹھہرے
اب اسی دُھن میں ہوں صبر آئے میرا دِل ٹھہرے

☆☆☆

تیرے آنگن میں پھول کھل آئے
میرے جیسا تو بدنصیب نہیں

☆☆☆

شکوۂ جور ستم گر سے کیا کرتا ہوں
دِل کے سمجھنے کا ہواؤں سے گلہ کرتا ہوں

مہرِ احباب سے کترا کے گزر جانا ہے
اب تو گھر چھوڑ کے بے زادِ سفر جانا ہے

☆☆☆

شل حوصلے ہیں دِل کے زخمی ہے ہاتھ پاؤں
ارمان کا لبادہ کانٹوں میں پھنس گیا ہے

☆☆☆

بس تجھے ہی رات دِن دیکھا کروں
اپنے بارے میں بھی کم سوچا کروں

☆☆☆

کیسا وہم دِل کا دامن پکڑ کے بیٹھا؟
کیسا یہ غم شکنجوں میں مجھ کو کس رہا ہے؟

☆☆☆

خواہش کے باوجود میں پل بھر نہ سو سکوں
آنکھوں کے تار میں کوئی موتی پرو سکوں
ہر بار میرے صبر کا مت لے تو امتحان
اتنا نہ بوجھ ڈال جسے میں نہ ڈھو سکوں

☆☆☆

گھر میں بیٹھا سوچ رہا تھا مجھ سا دُکھی ہے شہر میں کون
چھت پر چڑھ کر میں نے دیکھا لگی ہوئی ہے گھر گھر آ

بوئے گل کی طرح کہیں نہ ٹھہر
رشتہ ہر ایک سے موسمی رکھ لے

رہنِ اندوہ یاس پیہم ہوں
مجھ سے کم کم ہی دوستی رکھ لے

میں کسی دیس کا نہیں بابا
مجھ سے پہچان عارضی رکھ لے

سایہ قد سے طویل تر ہے یہاں!
دھوپ سے کون آشتی رکھ لے





Haqani Printing Press
Ph: 9419600060, 9419967694